وفا تعلق باللہ

کی ایک اہم اساس

امین احسن اصلاحی

وفا ایمان کے لازمی اور بنیادی تقاضوں میں سے ہے۔ وفا سے مراد یہ ہے کہ ہم نے اپنے رب سے جو عہد و میثاق کیے ہیں وہ پوری راست بازی کے ساتھ پورے کریں۔ یہ امر واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق دو مضبوط میثاقوں پر قائم ہے۔ ایک وہ میثاق ہے جو اس نے ہمارے پیدا کرنے سے پہلے ہماری ارواح سے لیا ہے اور جس کا ذکر سورۂ اعراف میں ہوا ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ○

(الاعراف: ۱۷۲)

اور یاد کرو، جب نکالا تمہارے رب نے بنی آدم سے ــــ ان کی پیٹھوں سے ــــ ان کی ذریت کو اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر۔ پوچھا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ بولے: ہاں! تو ہمارا رب ہے۔ ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ ہم نے اس لئے کیا کہ مبادا قیامت کو تم عذر کرو کہ ہم تو اس سے بے خبر ہی رہے۔

عہدِ فطرت

یہی وہ عہد ہے جس کو قرآن نے عہدِ فطرت سے بھی تعبیر فرمایا ہے:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا

(الروم: ۳۰)

اس دین فطرت کی پیروی کرو جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا۔

اس عہد میں جس طرح توحید کا اقرار شامل ہے اسی طرح تمام بنیادی نیکیوں کے نیکی اور تمام بڑی برائیوں کے برائی ہونے کا شعور بھی شامل ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے خود انسان کے نفس کو اس کے اوپر ایک حجت کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ سورۂ شمس میں فرمایا ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۝	اور شاہد ہے نفس اور جیسا کچھ اس کو
فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ۝	سنوارا، پس اس کو سمجھ دی اس کی بدی
قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَقَدْ	اور نیکی کی۔ کامیاب ہوا جس نے اس
خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۝	کو پاک کیا اور نامراد ہوا جس نے اسکو
(الشمس: ۷-۱۰)	آلودہ کیا۔

اسی عہدِ فطرت کی بنا پر ہر سلیم الحواس انسان توحید اور بنیادی نیکیوں اور بدیوں سے متعلق، قیامت کے دن مسئول ہوگا خواہ اس کو کسی نبی کی دعوت پہنچی ہو یا نہ پہنچی ہو۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعے ہر انسان پر حجت تمام کر دی ہے۔ اس کے بعد کوئی شخص، جیسا کہ سورۂ اعراف کی مذکورہ بالا آیت سے واضح ہے، یہ نہیں کہہ سکتا کہ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۝ (الاعراف: ۱۷۲) (ہم تو ان باتوں سے بے خبر ہی رہے)۔

قرآن کے نزدیک اس عہدِ فطرت کا اذعان و یقین انسان کے اندر اتنا محکم ہے کہ کوئی شخص اپنے رب کی کوئی نافرمانی کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ عین اس کے سامنے اس کی نافرمانی کرتا ہے۔ چنانچہ سورۂ قیامہ میں فرمایا ہے: بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ (القیٰمۃ: ۵) (بلکہ انسان چاہتا ہے کہ عین اپنے رب کے سامنے اس کی نافرمانی کرے)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا اپنا ضمیر خدائی کوتوال کی حیثیت سے اس کو عہد فطرت کی یاد دہانی کرتا رہتا ہے اور خود اپنے ضمیر کی تنبیہ کوئی دوسرا سنتا ہو یا نہ سنتا ہو، لیکن آدمی خود اس کے سننے سے قاصر نہیں رہتا اگرچہ وہ کتنی ہی سخن سازیاں کرے: بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ (القیٰمۃ: ۱۴-۱۵) (بلکہ انسان خود اپنے اوپر حجت ہے اگرچہ وہ کتنے ہی عذرات تراشے)۔

اگرچہ ایک بہانہ باز یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کو نہ تو اس طرح کا کوئی عہد ہی یاد ہے اور نہ وہ اپنے اندر اس طرح کی کوئی خلش ہی محسوس کرتا جس کو ضمیر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن آدمی سے اپنا باطن

پوشیدہ نہیں ہوتا۔ اس کے اندر ایک نفسِ لوامہ چھپا ہوا ہے جو اس کو اس کی ہر خلافِ ضمیر حرکت پر اس وقت تک سرزنش کرتا رہتا ہے جب تک وہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے اس کی زبان بالکل ہی بند نہ کر دے۔

باطن کی یہ آواز کسی خارجی دلیل و شہادت کی محتاج نہیں ہوتی ہے۔ اس کی دلیل و شہادت خود اس کے اندر ہی ہوتی ہے۔ خارج کی چیزوں میں سے کوئی چیز بھی اس سے زیادہ واضح نہیں ہے کہ اس سے اس پر کوئی دلیل قائم کی جا سکے۔ اس کی دلیل بس یہ ہے کہ انسان اس کو اپنے اندر پا رہا ہے اور ایسے تواتر و تسلسل اور ایسی وضاحت و قطعیت کے ساتھ پا رہا ہے کہ اس کی کسی طرح بھی تکذیب نہیں کر سکتا الا آنکہ وہ ہٹ دھرمی سے کام لے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مشہور فلسفی کانٹ نے اس اندرونی آواز INNER VOICE کو فلسفہ و منطق کے طریق احتجاج و استدلال کی گرفت سے بالکل بالاتر قرار دیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی یہ بات نہایت گہری حکمت پر مبنی ہے۔

یہ بات کہ انسان بدی کے بدی ہونے اور نیکی کے نیکی ہونے سے ازروئے فطرت واقف ہے یوں بھی ثابت ہے کہ اگرچہ وہ خود دوسروں کے ساتھ بدی کرتا ہے، لیکن وہی بدی اگر دوسرا اس کے ساتھ کرے، تو اس کو ظلم و ناانصافی ٹھہراتا اور اس کے خلاف احتجاج کرتا ہے یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ وہ نیکی اور بدی کے شعور سے عاری نہیں ہے، لیکن خود فریبی کے سبب سے اپنے لئے تو دوسروں سے وہ نیکی چاہتا ہے، لیکن دوسروں کے ساتھ بدی کی آزادی کا بھی خواہاں ہے۔ سورۂ مطففین میں قرآن نے اس کی اس کمزوری سے پردہ اٹھایا ہے:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ٥ الَّذِيْنَ اِذَا	برا ہو، ناپ تول میں کمی کرنے والوں
اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ٥	کا جو دوسروں سے نپوائیں تو پورا
وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ	نپوائیں اور جب ان کے لئے ناپیں یا
يُخْسِرُوْنَ ٥ ۔۔۔ (المطففین: ۳۱)	تولیں تو اس میں کمی کریں۔

میثاق شریعت

اگرچہ انسان پر حجت قائم کرنے اور اس کو مستوجب جزا و سزا قرار دینے کے لئے یہ عہدِ فطرت

بھی کافی تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس پر مزید یہ فضل فرمایا کہ اپنے نبی اور رسول بھیج کر اور اپنی شریعت نازل کر کے اس عہدِ فطرت کو بالکل واضح اور مبرہن اور ہر پہلو سے جامع و مکمل بھی کر دیا کہ کسی گمراہی میں پڑنے کے لئے کوئی رخنہ باقی نہ رہے تاکہ جو ہلاک ہو وہ اتمام حجت کے بعد ہلاک ہو اور جو زندگی کی راہ اختیار کرے وہ بھی دلیل کے ساتھ اختیار کرے۔

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ	تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے حجت دیکھ کر
وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ	ہلاک ہو اور جسے زندگی حاصل کرنی ہے
(انفال: ۴۲)	وہ حجت دیکھ کر زندگی حاصل کرے۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ شریعت انسان کے لئے کوئی اوپری اور انوکھی چیز نہیں ہے۔ بلکہ یہ عہدِ فطرت کے اوپر ایک دوسرا میثاق ہے جس نے سابق میثاق کو مزید مؤکد و موثق کر دیا ہے، جس سے گمراہی کی ہر راہ مسدود ہو گئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کو یوں کہئے کہ شریعت کی حیثیت انسان کے لئے تاریکی کے اوپر روشنی کی نہیں، بلکہ روشنی کے اوپر روشنی کی ہے۔ جیسا کہ سورہ نور میں ارشاد ہے: نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ (النور: ۳۵) (روشنی کے اوپر روشنی!) اس سے انسان کا باطن اور ظاہر، دونوں جگمگا اٹھتے ہیں۔ یہ تمثیل قرآن مجید میں یوں بیان ہوئی ہے:

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ	اللہ ہی آسمانوں اور زمین کی روشنی
مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا	ہے۔ دل کے اندر اس کے نورِ ایمان کی
مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ	تمثیل یوں ہے کہ ایک طاق ہو جس میں
اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ	ایک چراغ ہو، چراغ ایک شیشہ کے اندر
يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ	ہو، شیشہ ایک چمکتے تارے کی مانند ہو۔
لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ	چراغ ایک ایسے شاداب درختِ زیتون
زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ	کے روغن سے جلایا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو
نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ	نہ غربی۔ اس کا روغن اتنا شفاف ہو کہ
(النور: ۳۵)	گویا آگ کے چھوئے بغیر ہی بھڑک
	اٹھے گا۔ روشنی کے اوپر روشنی!۔

شریعت کے عہدِ میثاق ہونے کا ذکر قرآن میں اتنی کثرت سے ہوا ہے کہ اس کے حوالے نقل کرنا تحصیلِ حاصل ہے۔ بعض عظیم سورتوں کا تو موضوع ہی اس میثاق کی عظمت و اہمیت اور اس کی ذمہ داریوں کی توضیح و تفصیل ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری وفاداری کے ساتھ اس میثاق کی پابندی ہی پر بندوں کی دنیا اور آخرت، دونوں کی فلاح کا انحصار ہے۔ اس میثاق میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کے حقوق اور فرائض، دونوں تفصیل سے بیان کر دیے ہیں۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ بندے اپنے فرائض اگر وفاداری سے پورے کریں گے تو لازماً وہ اپنے حقوق اللہ تعالیٰ سے حاصل کریں گے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور اگر اس کی خلاف ورزی کریں گے تو اس بے وفائی کی سزا اس عالم میں بھگتیں گے اور آخرت میں بھی۔

سورۂ مائدہ میں اس میثاق کا ذکر اس طرح ہوا ہے:

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ	اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس
وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ	کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے
بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا	تم سے لیا جب کہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے
وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ	مانا اور اطاعت کی اور اللہ سے ڈرتے
بِذَاتِ الصُّدُورِ	رہو بے شک اللہ سینوں کے بھیدوں
(المائدۃ: ۷)	سے بھی باخبر ہے۔

اس آیت میں 'نِعْمَةَ اللَّهِ' سے مراد شریعتِ الٰہی ہے جو سب سے بڑے فضل کی حیثیت سے اس امت کو حاصل ہوئی اور 'میثاق' سے مراد وہ عہد و پیمان ہے جو اس شریعت پر پوری راست بازی اور کامل وفاداری سے عمل کرنے اور عمل کرانے کا لیا گیا اور پوری امت نے 'سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا' کہہ کر اس عہد کی پابندی کا اقرار کیا۔ اگرچہ یہ اقرار اول اول امت کے ہراول دستہ یعنی حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین ہی نے کیا، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی مخاطب وہی تھے، لیکن ہم بھی اس عہد و اقرار میں برابر کے شریک ہیں اگر ہم ان مقدس اسلاف کے خلف ہونے کے مدعی ہیں اور اس شرف سے محروم ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

وفاداری بشرطِ استواری:

اس دوہرے میثاق کی ذمہ داریوں کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا کوئی سہل بازی نہیں ہے۔ یہ بڑے جان جوکھم کا کام ہے۔ اس میں ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان ہیں جن سے صرف وہی عہدہ برآ ہوسکتے ہیں جن کو توفیقِ الٰہی کا بدرقہ حاصل ہو۔ اس میثاق کا صحیح صحیح حق ادا کرنے کے لئے اس حقیقت کو ہر وقت مستحضر رکھنا ضروری ہے کہ یہ حق صرف چند رسوم ادا کردینے سے پورا نہیں ہوتا، بلکہ پوری صداقت اور عزیمت کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے ہر حکم کی تعمیل اس کی شرطِ اول ہے اگرچہ اس راہ میں جان و مال اور کنبہ و خاندان، ہر چیز کو قربان کردینا پڑے۔ ہم سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جن قوموں سے میثاق لیا جب انھوں نے محض شریعت کے چند رسوم ادا کرکے اس کے وفاداروں میں نام لکھوانے کی کوشش کی تو اس نے ان کو ٹھکرادیا کہ اللہ تعالیٰ کو ایسے نام نہاد مدعیان وفاداری کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ، دونوں کو مخاطب کرکے فرمایا کہ:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ	خدا کے ساتھ وفاداری محض یہ نہیں ہے
قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ	کہ تم مشرق اور مغرب کی طرف رُخ
الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ	کرلو، بلکہ وفاداری ان کی وفاداری ہے
الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ	جو اللہ پر، یوم آخرت پر، فرشتوں پر،
وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى	کتاب پر اور نبیوں پر صدقِ دل سے
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ	ایمان لائیں اور اپنے مال اس کی محبت
وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ	کے باوجود، قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں،
وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ	مسافروں، سائلوں اور گردنیں چھڑانے
وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا	پر خرچ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ
عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ	ادا کریں جب معاہدہ کر بیٹھیں تو اپنے
وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ	عہد کو پورا کرنے والے ہوں۔ خاص کر
الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ	وہ لوگ جو فقر و فاقہ، تکالیفِ جسمانی اور

الْمُتَّقُوْنَ ۝ (البقرۃ: ۱۷۷)

اور جنگ کے اوقات میں ثابت قدم رہنے والے ہوں۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے راست بازی دکھائی اور یہی لوگ ہیں جو سچے متقی ہیں۔

آیت کی تفسیر

اس آیت نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچی وفاداری کے تمام تقاضے پوری وضاحت سے بیان کر دیئے ہیں۔ اس وجہ سے ہم اس کے بعض اہم اجزاء کی شرح کر کے ان کا مفہوم اچھی طرح واضح کر دینا چاہتے ہیں۔ تاکہ اوپر ہم نے جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے ان میں سے ہر بات، قرآن کی روشنی میں مبرہن ہو جائے۔

اس آیت میں لفظ 'بِرّ' جو آیا ہے اس کا ترجمہ عام طور پر ہمارے مترجم 'نیکی' کرتے ہیں۔ لیکن یہ اس لفظ کا ادھورا ترجمہ ہے، جس سے اس کا پورا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ قرآن اور کلام عرب میں اس لفظ کے مواقع استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا صحیح مفہوم 'وفاداری' ہے۔ ہم نے اپنی تفسیر ——— تدبر قرآن ——— میں اس کی تحقیق بیان کی ہے۔ اس مادے سے لفظ 'بَرٌّ' بھی ہے جس کے معنی وفاشعار اور فرماں بردار کے ہیں، مثلاً 'بَرٌّ بِوَالِدَیْهِ' اس بیٹے کو کہیں گے جو اپنے ماں باپ کا نہایت وفادار اور ان کے حقوق ادا کرنے والا ہو۔ اسی طرح 'بَرٌّ' اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر بھی استعمال ہوا ہے۔ اسلئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے جو عہد و پیمان اور جو وعدے کئے ہیں وہ سب ایک دن لازماً پورے کرنے والا ہے۔

اس روشنی میں 'لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ ..... الآیۃ' کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری کا حق صرف اتنے سے ادا نہیں ہو جاتا کہ رخ مشرق کی طرف کر لیا یا مغرب کی طرف۔ یہ تو محض دین کے ظواہر ہیں۔ اصل وفاداری اور دینداری تو ان لوگوں کی ہے جو اللہ پر، روزِ جزا پر، فرشتوں پر، کتاب الٰہی پر سچا اور پکا ایمان لائیں اور ساتھ ہی قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور غلاموں کی آزادی کے لئے اپنے مال خرچ کریں۔

یہ بات، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، ان یہود و نصاریٰ کو مخاطب کر کے فرمائی گئی ہے۔

جن کے ہاں ایک خاص دور میں یہ بحث کہ قبلہ مشرق کی طرف ہے یا مغرب کی طرف، اس زور شور سے چھڑی ہوئی تھی کہ گویا تمام دین کا انحصار بس اسی چیز پر ہے درآنحالیکہ دین کی بنیادی باتوں یعنی ایمان کے تقاضوں اور اس کے عملی مطالبات کا کسی کو بھی احساس نہیں تھا۔ ان کو مخاطب کر کے تنبیہ فرمائی گئی کہ نادانو، ان ظاہری رسم داریوں سے خدا کی وفاداری کا حق ادا نہیں ہوتا۔ خدا کا حق ادا کرنے والے وہ لوگ بنیں گے جو ایمان کے حقیقی عقائد اور عملی تقاضے پورے کرنے والے ثابت ہوں گے۔ یہ اسی طرح کی تنبیہ ہے جس طرح کی تنبیہ سیدنا مسیح علیہ السلام نے یہود کو فرمائی کہ تم مچھر کو تو چھانتے ہو پر اونٹ کو نگل جاتے ہو، یا یہ کہ تم رکابی کو اوپر سے تو صاف کرتے ہو پر وہ اندر لوٹ کے مال سے بھری ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات نگاہ میں رکھنے کی ہے کہ ایمان کے عملی تقاضوں میں سے سب سے پہلے انفاق کا ذکر آیا ہے حالانکہ قرآن کا طریقہ یہ ہے کہ ایمان کے بعد وہ بالعموم نماز کا ذکر کرتا ہے، لیکن یہاں نماز کا ذکر موخر ہو گیا ہے۔ پھر مزید قابل توجہ بات یہ ہے کہ 'ایتائے مال' کے ساتھ ایتائے زکوٰۃ کا ذکر الگ ہوا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کے مال میں اللہ تعالیٰ کا حق صرف زکوٰۃ ہی نہیں، بلکہ اس کے علاوہ بھی ہے اور وفاداری کا مقام حاصل کرنے کے لئے اس کو ادا کرنا بھی ضروری ہے۔

یہ پہلو خاصی اہمیت رکھنے والے ہیں اس وجہ سے ہم بالاختصار ان کی وضاحت کی کوشش کریں گے۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہاں ایتائے مال کا ذکر اقامتِ صلوٰۃ پر مقدم ہے جو بظاہر قرآن کے معروف اسلوب کے خلاف ہے۔ لیکن اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ وہ یہ کہ یہاں بتانا یہ مقصود ہے کہ مومن کو اللہ تعالیٰ کی کامل وفاداری کا مرتبہ و مقام کس طرح حاصل ہوتا ہے؟ اس سوال کا واحد جواب، قرآن کی روشنی میں، یہی ہے کہ یہ مرتبہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں محبوب مال کے انفاق سے حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام میں ارشاد ہے 'لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ' (آل عمران: ۹۲) (تم خدا کی وفاداری کا درجہ ہرگز نہیں حاصل کر سکتے۔ جب تک ان چیزوں میں سے نہ خرچ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو) بالکل یہی بات یہاں 'وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ' کے الفاظ سے فرمائی ہے یعنی وہ اپنے مال، ان کے محبوب ہونے کے باوجود، اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ مال کے محبوب ہونے

کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مال بجائے خود اعلیٰ اور قیمتی ہو، دوسرا یہ کہ زمانہ ایسا ہو کہ اس میں وہ مال کمیاب ہو۔ مثلاً زمانہ قحط یا گرانی کا ہو۔ تیسرا یہ کہ آدمی کو خود اس مال کی احتیاج ہو لیکن وہ اپنی ضرورت پر اللہ کے دوسرے بندوں کی ضرورت کو ترجیح دے: يُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر: ۹) (وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ انھیں خود احتیاج ہو یہاں 'عَلَىٰ حُبِّهِ' کے الفاظ ان تمام پہلوؤں پر حاوی ہیں۔

رہا دوسرا سوال کہ کیا زکوٰۃ کے علاوہ مسلمان کے مال میں اللہ تعالیٰ کے کچھ اور حقوق بھی ہیں جن کا ادا کرنا مرتبہ برّ و وفا حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ زکوٰۃ مسلمان کے مال میں سے وہ کم سے کم مطالبہ ہے جس کا پورا کرنا اسلامی حکومت کی گرفت سے بچنے کے لئے ضروری ہے۔ یہ مطالبہ پورا کر دینے کے بعد حکومت اس سے کوئی تعرض نہیں کرے گی لیکن اللہ تعالیٰ کا مطالبہ بندوں سے صرف زکوٰۃ کا نہیں ہے بلکہ انفاق کا ہے جو سرًا بھی ہو اور علانیۃً بھی "اقراض" کا مطلب یہ ہے کہ اگر ملت کو کوئی ناگہانی ضرورت یا حالتِ جنگ یا قحط یا کوئی آفت کے باعث کوئی ناگزیر حاجت پیش آجائے تو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں دل کھول کر خرچ کریں۔ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے ذمہ قرض کی حیثیت سے قبول فرمائے گا اور قیامت میں اس کو ایک عظیم خزانہ کی صورت میں واپس کرے گا بشرطیکہ یہ قرض، قرضِ حسن ہو۔ اس انفاق کی آخری حد یہ مقرر فرمادی ہے کہ اس طرح کے حالات میں آدمی اپنے اور اپنے بیوی بچوں کو ناگزیر ضروریات سے جو کچھ بچا سکے سب اللہ کی راہ میں خرچ کر دے۔ 'قُلِ الْعَفْوَ' میں 'عفو' کی تفسیر ہمارے نزدیک یہی ہے۔ یہی انفاق ان لوگوں کے شایان شان ہے۔ جو اللہ کے وفادار اور کامل العیار بندے بننا چاہتے ہیں اور قرآن مجید کے تدبّر سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ یہی انفاق ہے جس کے صلہ میں اللہ تعالیٰ انفاق کرنے والے کو حکمت کا خزانہ بخشتا ہے جس کے بارے میں ارشاد ہے کہ 'وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا'

(البقرۃ: ۲۶۹) (------) اور جسے حکمت ملی اسے خیر کثیر کا خزانہ ملا)۔

اس آیت میں 'وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا' کے الفاظ بھی خاص طور پر غور کرنے کے ہیں۔ اوپر کی باتیں تو فعل کے صیغوں میں بیان فرمائیں، لیکن ایفائے عہد کو صفت کے صیغے سے بیان کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری کا حق ٹھیک ٹھیک وہی لوگ

ادا کر سکتے ہیں جن کے اندر ایفائے عہد کی خصلت صفۃً موجود ہو۔ وہ جب کبھی بھی کسی سے کوئی عہد کر بیٹھتے ہوں تو اس کے ایفاء کو اپنی فتوت کا لازمی تقاضا اور اپنی حمیت کا ایک واجبی مطالبہ سمجھتے ہوں۔ اس حقیقت کا اظہار 'اِذَا عٰهَدُوْا' کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔ یعنی جب وہ کوئی عہد کر بیٹھتے ہیں تو قولِ مرداں جاں دارد کے مصداق اس کے لئے جان لڑا دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنے عام وعدوں کے معاملہ میں جن کا کردار یہ ہو گا وہ اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد کے معاملہ میں کبھی کسی کمزوری کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے۔

وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ، اس ٹکڑے کا عطف ہے تو وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ ہی پر لیکن صفتِ صبر پر خاص طور پر زور دینے کے لئے اس کو حالتِ نصب میں کر دیا ہے۔ جس سے اس کے معنی میں یہ اضافہ ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کی وفاداری کا حق ادا کرنے والے خاص طور پر وہ لوگ ہوں گے جو فقر و فاقہ، جسمانی تکالیف اور جنگ کے مصائب کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنے والے ہوں گے۔

یہی بات اس باب کی آخری بات ہے۔ ظاہر ہے کہ جب وفاداری بشرطِ استواری مطلوب ہے، جس کے بغیر ایمان، ایمان نہیں، بلکہ صریح نفاق ہے تو اس کے لئے سب سے بڑی شرط صبر یعنی عزیمت و استقامت ہی ٹھہرے گی۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین کو مخاطب کر کے سرزنش کی ہے کہ کیا تم نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ تم ایمان کا دعویٰ کر کے اپنے کو اہلِ ایمان میں شمار کرا لو گے اور تمہارے جھوٹے اور سچے میں امتیاز کے لئے اللہ تعالیٰ تمہیں کسی امتحان میں نہیں ڈالے گا؟ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر مدعی کے لئے جگہ نہیں ہے۔ اس کے ہاں شرفِ باریابی صرف انہی کو حاصل ہو گا جو ہر قسم کے امتحانوں سے گزر کر یہ ثابت کر دیں گے کہ انھوں نے 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کا جو عہد کیا ہے اس میں وہ بالکل سچے اور پکے ہیں۔ فرمایا کہ: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا یہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے ہاں راست باز ٹھہریں گے اور وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ اور یہی لوگ ہیں جو اسکی نگاہوں میں حقیقی متقی ہیں۔

(تدبر مئی ۱۹۹۳ء)